

## Dadi Ki Haveli

[میری عمر تیرہ برس تھی جب اپنے والدین سے بچھڑی۔ صرف والدین سے ہی نہیں تایا، تائی، ان کے بچوں اور پیار کرنے والی دادی سے بھی! بس اک ذرا زمین بلی اور سبھی مجھ سے اوجھل ہو گئے یا میں گم ہو گئی۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہم سب اکٹھے رہا کرتے تھے۔ ہمارا بھرا پرا کنبہ تھا جس کی سرپرست دادی جان کی شفیق ذات تھی۔ تائی مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ وہ مجھے اپنی بہو بنانے کے خواب دیکھتی تھیں۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی مگر سب کی لائلی تھی اور شاہ میر تو میرا بچپن کا ساتھی تھا۔ وہ میرے تایا کا بیٹا تھا جس کے ساتھ میری شادی کے منصوبے بن چکے تھے لیکن ہمیں پڑوں کے ارادوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ ان کے ارادوں سے بے نیاز ہم بچپن کے ساتھی! میں، آمنہ، شاہ میر اور فریحہ سب اکٹھے کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ دادی جان کا گھر بہت کشادہ اور وسیع تھا جو انہی کے نام سے دادی کی حویلی کہلاتا تھا۔ رشتے دار جب ہمارے گھر آنے کا ارادہ کرتے، یہی کہنے کے دادی کی حویلی جانا ہے حالانکہ وہ صرف ہماری دادی تھیں لیکن دادی کی حویلی کی نسبت سے وہ سب کی دادی ہو جاتی تھیں۔ ہماری دادی تو بے مثال تھیں۔ انہوں نے جس قدر پیار ہم سے کیا، اس کی فی زمانہ مثال نہیں ملتی۔ جب میں بارہ برس بعد وطن لوٹ رہی تھی تو ہوائی جہاز میں بیٹھی یہی سوچے جارہی تھی کہ دادی زندہ بھی ہوں گی؟ میں انہیں دیکھ پاؤں گی کہ نہیں...! وہ حویلی میں مجھے دکھائی نہیں دیں گی، ایسا تو تصور بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیا بتائوں کہ اپنوں سے بچھڑ جانے کا دکھ کیا ہوتا ہے اور اپنوں سے ملنے کی چاہ کس قدر تڑپاتی ہے۔ جب تک انسان زندہ رہتا ہے، یہ تڑپ صرف وہی جانتے ہیں جو اپنوں سے بچھڑ جانے کا دکھ جھیلتے ہیں۔ ایئر پورٹ پر اتری اور اصف سے کہا کہ اب یہاں بالکل نہیں رکنا، اسلام آباد بھی واپسی پر گھوم لینا۔ گاڑی بائز کرو اور پنڈی اس جگہ چلو جہاں پر ہماری دادی کی حویلی ہے۔ اصف نے میرے جذبات سمجھتے ہوئے کہا۔ جانتا ہوں تمہیں اپنے گھر جانے کی بہت جلدی ہے، میں تمہیں وہیں لے چلتا ہوں۔ سوچ رہا ہوں تمہارا یہ حال ہے تو تمہیں دیکھ کر تمہارے تایا، تائی اور ان کے بچوں کا کیا حال ہوگا، یقیناً وہ خوشی سے رو پڑیں گے۔ اللہ نہ کرے جو میرے اپنے روئیں۔ ایسی باتیں منہ سے مت نکالنے۔ یونہی باتیں کرتے کرتے ہم اس قدیم عمارت کے سامنے پہنچ گئے جہاں کبھی گیٹ کے ایک پلے پر دادی کی حویلی کی تختی اویزاں ہوا کرتی تھی۔ آج یہاں کوئی تختی تھی اور نہ وہ پھولوں سے لدی بیلین تھیں جو کبھی گیٹ کے اوپر سے دیواروں پر پھیلی ہوئی تھیں جن کے بیچ ہمارا گھر ایک دہلیز کی طرح بنناستورا ہوا کرتا تھا۔ آج دیواروں کے اردگرد جھاڑ جھنکار اور گیٹ مٹی سے آٹا ہوا اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ یہاں اب برسوں سے کوئی نہیں رہتا۔ اپنے گھر کو ویران دیکھ کر جو کبھی میرے بچپن کے خوشیوں کا گہوارہ تھا، میرا دل بیٹھ گیا۔ یہاں پہنچنے سے قبل جو خوشی تھی، وہ اب کافور ہو چکی تھی۔ میرے بجھے ہوئے چہرے پر اصف نے نظر ڈالی اور کہا۔ سعدیہ! حوصلہ رکھو سبھی وقت کے ساتھ نقل مکانی کرتے ہیں۔ مدت بعد آتی ہو، حویلی میں رہنے والے اب کسی نئے گھر میں شفٹ ہو گئے ہوں گے۔ حویلی میں کوئی چوکیدار تو ہوگا، ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ گیٹ پر گاڑی رکوا کر ہم نے اردگرد دیکھا۔ دور دور تک کسی انسان کا نام و نشان نہ تھا۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ ہماری قدموں سے واپس لوٹنے کو تھے کہ ذیلی سڑک سے ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ وہ ہماری طرف ہی آ رہا تھا۔ ٹھوڑی سی دیر میں وہ ہمارے قریب پہنچا۔ بولا۔ صاحب! ادھر کوئی نہیں آتا، آج گیٹ پر گاڑی دیکھی تو میں سمجھا کہ فیض صاحب آئے ہیں۔ فیض میرے تایا کا نام تھا۔ میں نے کہا۔ ہاں! میں انہی کی بھیجی ہوں، گھر دیکھنا چاہتی ہوں۔ حویلی کی چابی کس کے پاس ہے؟ کہنے لگا۔ میرے پاس ہے۔ فیض صاحب نے دی ہوئی ہے تاکہ کبھی کبھی گیٹ کھول کر اندر باہر دیکھ لیا کروں۔ جب کبھی وہ آتے ہیں، مجھے فون کر دیتے ہیں کہ صفائی کروا دو۔ اب تو مدت سے ان کا کوئی فون نہیں آیا۔ یہ حویلی ویران پڑی ہے۔ اس نے گیٹ کھولتے ہوئے کہا۔ میں لندن سے آتی ہوں اور یہ میرے شوہر اصف ہیں۔ ہم دونوں آج ہی آئے ہیں اور صبح ہونے کا بس انتظار کیا اور سیدھے ادھر آ گئے ہیں۔ مجھے چوکیدار کی زبانی اپنے عزیزوں کے زندہ ہونے کا ثبوت مل گیا۔ چائے، پانی وغیرہ! جو حکم کریں؟ اس نے کہا۔ کچھ نہیں چاہیے۔ پانی وغیرہ ہے ہمارے پاس...! تم باہر ٹھہر جاؤ، ہم ذرا اندر کا چکر لگا لیں۔ وہ بولا۔ ٹھیک ہے بی بی...! میں ادھر ہی ٹھہرتا ہوں۔ میں بولے بولے قدم بڑھاتی حویلی کے اپنی گیٹ سے آگے بڑھنے لگی۔ خشک پتوں کے چرچرانے کی آواز سنائے میں عجیب لگ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی دل کی اور بی کیفیت ہو گئی۔ وہ رہائشگاہ جہاں کبھی رونق ہوتی تھی اور ہم بچے دوڑتے پھرتے تھے، آج یہاں ویرانی کا راج تھا۔ حویلی کا اندرونی لان جو کبھی پھولوں اور بیل بوتوں سے سجا رہتا تھا، اب زمانے کی ستم ظریفی اور گزرتے وقت کی شکست و ریخت کی داستان بیان کر رہا تھا۔ جوں جوں آگے جارہی تھی، دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ گونگی بہری فضا بتا رہی تھی کہ برسوں سے یہاں کوئی نہیں آیا۔ وہ لوگ جن کے ملنے کی آرزو مجھے اتنے برس تڑپاتی رہی تھی، نجانے کہاں جا چھپے تھے۔ سارے درخت، درودیوار سبھی منظر گونگے تھے۔ کوئی ایسا نہ تھا جس سے میں اپنے پیاروں کے متعلق پوچھ سکتی۔ اصف خاموش سائے کی مانند مجھ سے دو قدم پیچھے چل رہے تھے۔ وہ مجھے مزید ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لان کے کونے میں پھیل کے درخت کی طرف بڑھتے دیکھ کر اصف نے پوچھا۔ کیا گھر کے اندر نہیں جاؤ گی؟ نہیں...! مجھ میں ویران کمروں میں جانے کا حوصلہ نہیں۔ جنہیں دیکھنے کی شدید آرزو لے کر یہاں آئی تھی، وہ تو جانے کہاں کھو گئے ہیں، اندر جاکر کیا کروں گی۔ ایسی بولناکی کہ کھانے کو دوڑتی ہے۔ پرانے درخت کے نیچے ایک بینچ ابھی باقی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گئی۔ اصف ذرا دیر یہاں بیٹھ جاؤ، میں خود کو تھکا ہوا محسوس کر رہی ہوں۔ سعدیہ! بینچ پر بہت گرد ہے، اسے ذرا سا صاف تو کرنے دو۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر کہا۔ یہ اتنی زیادہ ہے کہ اس چھوٹے سے رومال سے صاف نہیں ہوگی۔ گرد کپڑوں کو لگتی ہے تو لگنے دو۔ گرد کو جب جھاڑیں گے تو وہ خود اتر جائے گی۔ اس نے میری بات سنی ان سنی کردی اور ٹھوڑی سی جگہ اپنے بیٹھنے کیلئے رومال سے صاف کر لی۔ وہ دیکھو درخت کی اس شاخ پر جھولا بندھا ہوا تھا۔ لیکن اب تو یہاں کوئی جھولا نہیں ہے، ہر طرف سوکھے پتوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ مجھے تو اب بھی نظر آ رہا ہے۔ وہ جھولا...! میرے تصور کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ دیکھنی رہو اپنے تصور کی آنکھوں سے! وہ سوکھے پتوں پر بوٹ مار کر انہیں توڑنے لگا۔ تبھی ان پتوں کے اندر پڑی کوئی چیز اس کے بوٹ سے ٹکرا گئی۔ اس نے اسے اٹھا لیا۔ یہ ایک ٹوٹی ہوئی گڑیا تھی جو بوٹ کی چوٹ لگنے سے مزید ٹوٹ گئی۔ یہ گڑیا میری ہے۔ میں ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ میں نے ہلک کر اس کے ہاتھ سے وہ گڑیا لے لی جس کے بال مٹی مٹی اور چہرہ بھی خاک آلود تھا۔ اس نے کچھ کہے بغیر ٹوٹا ہوا کھلونا مجھے دے دیا اور میں اسے ہاتھ میں لیتے ہی ماضی کے دریچوں میں گزرتی یادوں کی دنیا میں چلی گئی۔

تک پہنچ گئی مگر گڑیا ہمیشہ شاہ میر میری گڑیا چھین کر یہاں پتوں میں چھپا دیا کرتا تھا۔ بچپن بیت گیا۔ میں اٹھویں میرے ساتھ رہی۔ اسے شاہ میر مجھ سے چھین کر چھپاتا رہا اور میں ڈھونڈتی رہی۔ گڑیا ہمیشہ مجھے مل جاتی تھی مگر آج یہ اصف کو مل گئی تھی۔ مجھے لگتا ہے تم کچھ زیادہ جذباتی ہو گئی ہو یہاں آکر! ضروری نہیں یہ وہی گڑیا ہو تمہاری والی...! یہاں اور بھی بجے آئے ہوں گے، ان میں سے کسی کی بوسکتی ہے۔ نہیں...! میں اسے پہچانتی ہوں۔ یہ میری بی بی ہے۔ ٹھیک ہے بھئی! جیسے تم خوش، ویسے ہم خوش...! حالانکہ گڑیاں سبھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ مجھے آمنہ اور فریحہ یاد آئے لگیں جن کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مجھے کبھی بہنوں کی کمی محسوس نہ ہوئی تھی۔ صبح سویرے دادی سب کو نماز کے لیے جگا دیتیں۔ ہم ناشتہ کرتے اور اسکول چلے جاتے۔ ہر صبح بیدار ہونے کی بیزاری سے جان بچانے کے لیے چھٹی والے دن سے ایک روز پہلے دادی سے کہتے۔ کل صبح مت جگانا دادی! کل ہمیں دیر تک سونا ہے۔ اچھا! ٹھیک ہے۔ وہ کہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اٹھ جانا، نماز پڑھ کر پھر بے شک سو جانا۔ وہ صبح یاد آئی جب میں اٹھی تو امی سامان پیک کر رہی تھیں۔ ہم کہاں جارہے ہیں امی؟ دوسرے شہر! جہاں تمہارے ابو کی پوسٹنگ ہو گئی ہے بیٹی! میرے والد صاحب اپنوں سے الگ رہنے پر اداس تھے مگر جانا ہی تھا۔ وہ جس محکمے میں آفیسر تھے، ان کی کہیں بھی پوسٹنگ بوسکتی تھی۔ میں بھی اپنوں سے بچھڑنے پر اداس تھی۔ دادی، تایا، تائی، شاہ میر، اس کی بہنیں آمنہ اور فریحہ سبھی ابیدہ تھے۔ جب ہماری گاڑی حویلی سے نکلی، میں نے بھیگی آنکھوں سے گھر کو دیکھا تھا، ہاتھ ہلاتا تھا۔ انہوں نے بھی ہاتھ ہلا کر خداحافظ کہا تھا۔ یہاں پر آئے ہمیں ایک ماہ ہوا تھا اور میرا داخلہ اسکول میں ہو گیا تھا کہ ایک صبح اسکول جانے کو تیار ہو رہی تھی تو ابو نے آواز دی۔ سعدیہ! جلدی کرو اور گاڑی میں بیٹھو، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں ان کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ مجھے اسکول چھوڑنے پہر اپنے دفتر چلے جاتے تھے۔ اتنا یاد ہے جوہی میں نے گاڑی سے نکل کر اسکول کی طرف قدم بڑھایا تھا کہ زور کی گڑگڑاہٹ سنی۔ ایسی خوفناک آواز اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ بس مجھے چکر سا آگیا۔ جہاں کھڑی تھی، وہاں گر گئی۔ اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا۔ ہوش آیا تو اسپتال میں تھی۔ ایک انکل اور انٹی میرے قریب کھڑے کبہ رہے تھے۔ شکر ہے بچی کو ہوش آگیا ہے۔ پھر ایک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ بیٹی! آنکھیں کھولو۔ میں نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف نامانوس چہرے نظر آئے۔ امی، ابو کہیں دکھائی نہ دیئے۔ میری نظریں انہیں ڈھونڈنے لگیں۔ تمہارے ابو اور امی گھر پر ہیں، تم ٹھیک ہو جانو تو تمہیں لے چلیں گے ان کے پاس...! میری حالت تسلی بخش ہو گئی تو یہ دونوں مہربان میاں، بیوی مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔ جب اپنے والدین کا پوچھتی وہ کچھ نہ بتاتے بس ٹال جاتے۔ سر پر چوٹ لگی تھی، میری یادداشت پر اثر پڑا تھا۔ امی، ابو کے سوا کچھ یاد نہ آتا تھا۔ ذہن پر زور دیتی تو سر دکھنے لگتا، کانوں میں وہی خوفناک گڑگڑاہٹ گونجنے لگتی اور میں پریشان ہوجاتی۔ میری ذہنی حالت خراب ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کو دکھایا۔ انہوں نے کہا کہ ابھی اس بچی سے کوئی سوال نہ کریں، کچھ مت پوچھیں۔ رفتہ رفتہ سب کچھ یاد آجائے گا۔ از خود گھر والوں کے بارے میں بتائے گی۔ چہ ماہ بعد انکل اور انٹی مجھے لندن لے آئے۔ میرا علاج ہوا۔ کافی حد تک میں ٹھیک ہو گئی۔ وہ مجھ سے یہ بات چھپانا چاہتے تھے کہ میرے والدین زلزلے میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ وہ مجھے مزید دکھ نہیں دینا چاہتے تھے۔ کہتے تھے بیٹی! آپ کو حکومت نے یہاں علاج کیلئے بھجوا دیا ہے۔ ضرور ایک دن آپ کو گھر واپس لے چلیں گے۔ آپ یہاں رہ کر تعلیم حاصل کریں۔ ان لوگوں نے مجھے بہت پیار دیا اور پھر میں نے اپنوں کے پیار کو دل میں دبا دیا۔ سوچا چلو پڑھائی کرلوں۔ یقین تھا کہ یہ اچھے لوگ ہیں جو مجھ سے پیار کرتے ہیں، ضرور ایک دن میرے والدین کے پاس لے جائیں گے۔ جب میں پوری طرح ٹھیک ہو گئی بالآخر میرے انکل اور انٹی نے طریقے سے سمجھا کر بتایا کہ بیٹی! تمہارے والدین زلزلے میں ہلاک ہو گئے ہیں، اب تم وہاں جا کر زیادہ دکھی ہو جانو گی۔ بہتر ہے کہ ہماری بیٹی بن کر ہمارے پاس رہو۔ اس روز میں بہت روٹی تھی پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اتنے مہربان لوگوں کو اداس کر کے ہرگز نہیں جائوں گی جنہوں نے مجھے بیٹی بنایا، علاج کروایا۔ یہ بھی مظفر آباد کے رہنے والے تھے۔ لندن میں گھر اور کاروبار تھا۔ جن دنوں زلزلہ آیا، یہ اپنوں سے ملنے وہاں آئے ہوئے تھے اور میں انہیں مل گئی۔ یہ بے اولاد تھے، انہوں نے مجھے والدین جیسا سچا پیار دیا۔ مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ مجھے یہی بتایا گیا کہ میرے سارے لوگ ختم ہو گئے ہیں لیکن ایسا نہیں تھا۔ دادی کی حویلی بہت مضبوط تھی، پرانے وقتوں کی۔ جہاں یہ رہائشگاہ تھی، وہاں زلزلے سے نقصان بھی بہت کم ہوا تھا۔ امی، ابو کے سوا باقی سب لوگ سلامت تھے شاید انہوں نے مجھے ڈھونڈا ہوگا یا والدین کی وفات کی تصدیق پر ان کا خیال ہوگا کہ میں بھی زلزلے کی نذر ہو چکی ہوں۔ خدا جانے! لیکن اب میرا ان کے ساتھ کوئی رابطہ نہ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ دادی کی حویلی سے تایا نقل مکانی کر کے لاہور چلے گئے تھے اور ان کا رابطہ ہمارے ساتھ نہیں ہو پایا تھا۔ لندن آئے ہوئے مجھے دس سال ہو چکے تھے۔ انکل اب کافی بوڑھے ہو گئے تھے۔ وہ بیمار ہو گئے تو میں اور زیادہ دکھی رہنے لگی کیونکہ سفید بالوں اور سفید رنگت والا یہ فرشتہ صورت آدمی میرے لئے ابو جیسا ہی مہربان تھا۔ جس نے میرا بے حد خیال رکھا تھا اور انٹی بھی کچھ کم محبت نہ کرتی تھیں۔ یہ دونوں نہ ہوتے تو شاید میں مر جاتی۔ ان لوگوں نے کبھی اپنے عزیزوں کے بارے میں نہیں بتایا۔ مجھ سے اب پچھڑنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے بعد میں میرے تایا کو بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ ان کے خیال میں سبھی مر چکے تھے۔ انکل جب زیادہ بیمار تھے، انہوں نے میری شادی اپنے دوست بیٹے اصف سے کر دی۔ یہ لوگ اکثر انکل کے گھر آتے تھے۔ اصف نے مجھے دیکھا، پسند کیا اور مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار اپنے والدین کیا۔ یوں مجھے ایک اچھا جیون ساتھی ملا۔ میری شادی کے ایک سال بعد انکل کی وفات ہو گئی، ایک بار پھر مجھے اسی صدمے سے گزرنا پڑا جو والدین کی وفات کی خبر سن کر ہوا تھا۔ ایک دن مجھے اداس دیکھ کر اصف نے کہا۔ میں تمہیں پاکستان لے جاتا ہوں، وہاں تم اپنے گھر کو دیکھنا اور اپنے رشتے داروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا۔ کیا خبر وہ زندہ ہوں۔ اس کی یہ تسلی میرے لئے نئی زندگی کی نوید بن گئی۔ میں نے چہ ماہ اور انتظار کیا بالآخر ہم نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھ دیا۔ یہاں آئے پر اداس بھی تھی اور خوش بھی کہ چوکیدار نے تایا اور ان کے گھر والوں کا پتا بتا دیا تھا۔ ہم حویلی سے نکل کر لاہور آئے۔ اصف کے رشتے دار بھی اسی شہر میں رہتے تھے لیکن وہ پہلے مجھے تایا کے گھر لے آئے۔ جب ہم نے چوکیدار کے دینے نمبر پر فون کیا تو شاہ میر نے اٹھایا۔ اس کے لہجے میں خوشی تھی۔ کہا کہ آجائو، ابو بھی گھر پر ہیں۔ بس فوراً آجائو جہاں بھی ہو۔ ہم تو سمجھے تھے کہ تم چچا جان اور چچی کے ہمراہ چلی گئی ہو۔ شکر کہ تم زندہ ہو۔ اس کے ان الفاظ نے میرے کانوں میں رس گھول دیا تھا۔ جب ہم تایا کے گھر پہنچے تو میں بہت پرجوش تھی مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ تایا اور تائی نے بے حد سرد مہری سے میرا استقبال کیا۔ پیاری دادی اس جہاں میں

بڑے نیپے تلے انداز نہیں رہی تھیں، آمنہ اور فریحہ کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ شاہ میر نے اپنی بیوی سے ملوایا۔ وہ بھی میں ملی۔ صرف ایک شاہ میر ہی تھا جو مجھے زندہ دیکھ کر خوش نظر آتا تھا باقی سب لوگ اتنے اجنبی سے ہو گئے تھے جیسے کہ وہ میرے زندہ لوٹ آئے پر دکھی ہو گئے ہوں۔ میں اپنوں کا یہ رویہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ میں تو سمجھی تھی کہ وہ دوڑ کر گلے لگائیں گے اور خوشی کا اظہار کریں گے۔ ثانی نے کہا۔ آج دوپہر کا کھانا کھا کر جانا۔ شام سے پہلے نہیں جانے دوں گی۔ دل نے جھرجھری سی لی۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ ہم تو کچھ دن کے لئے یہاں رہنے آئے تھے کہ یہ میرے اپنوں کا گھر تھا، میرا میکہ تھا۔ ابو، امی نہ رہے تو کیا ہوا، ثانی، ثانی بھی تو ماں، باپ جیسے ہوتے ہیں۔ ابھی میں حیرت، ثانی کو دیکھ رہی تھی کہ تایا نے بیوی کو گھر کا۔ ارے بھئی لندن سے وہ بھی چند دنوں کے لئے! انہیں سو کام ہوں گے، اوروں سے بھی ملنا ہوگا۔ ہمارے گھر رہنے تھوڑی آئے ہیں۔ احمق ہو تم بھی! پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ بیٹا! اگر جانا ہے تو ہماری طرف سے کوئی اڑچن نہیں ہے۔ جب فراغت ملے پھر آجانا یا فون کر دینا۔ جہاں ٹھہرے ہو گے، میں ملنے آجائوں گا۔ میرا دل جو اتنے برس سے ان لوگوں سے ملنے کو تڑپ رہا تھا، دھڑکنا بھول گیا۔ اصف نے کہا۔ تایا جی! آپ فکر نہ کریں یہاں میرے رشتے دار بھی ہیں، ہم وہاں ٹھہر جائیں گے۔ شاہ میر نے محسوس کیا کہ اس کے والدین نے میرے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا مگر وہ چپ تھا شاید اپنی بیوی کی وجہ سے جو تیوری چڑھائے بیٹھی تھی۔ ملازم نے چائے لا کر رکھی، مجھ سے نہیں پی گئی۔ اصف نے بھی کہہ دیا۔ آنکل! میں چائے نہیں پیتا۔ ہم چلنے کو ہوئے تو ثانی نے بے جاں آواز میں کہا۔ ”بیٹا! کبھی کبھی لندن سے فون کرتی رہا کرو۔ آمنہ اور فریحہ کو بتائوں گی تم آئی تھیں تو دکھ کریں گی کہ تم سے نہ مل سکیں۔ میں اور زیادہ حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگی کہ یہ انہیں ابھی فون کر کے کیوں نہیں کہنتیں کہ آجائو، دیکھو کون آیا ہے؟ سعدیہ آئی ہے اور وہ زندہ ہے، لندن سے ملنے آئی ہے۔ تو یہ تھے اپنے جن سے ملنے کو میں رویا کرتی تھی۔ اصف سے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی جس سے کہا کرتی تھی کہ دعا کرو میرے اپنے زندہ ہوں اور مجھے مل جائیں۔ میں بہت دن ان کے پاس رہوں گی۔ ہم تایا کے گھر سے نکلے تو مجھے خجل دیکھ کر میرے شوہر نے کہا۔ رنج مت کرو اور شکر کرو کہ یہ لوگ زندہ ہیں، زلزلے میں نہیں چلے گئے۔ تبھی میرے دل نے کہا۔ کہاں زندہ ہیں؟ جب تک ان سے نہیں ملی تھی، زندہ تھے میرے دل میں مگر اب زندہ مل گئے تو لگتا ہے کہ میرا دل بھی دادی کی حویلی کی طرح خالی اور ویران ہو گیا ہے۔ چوکیدار کا شام کو فون آگیا۔ بولا۔ بی بی! آپ گئے تھے اپنے تایا کے گھر مگر دوبارہ نہیں جانا۔ انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا ہے کہ ان کا پتا اور فون نمبر آپ کو کیوں دیا۔ آپ کا جائیداد میں حصہ ہے نا۔ انہیں ڈر ہے کہ آپ اپنا۔ لینے آئی ہیں۔ میں نے کہا۔ بابا! ان سے کہنا کہ مجھے اپنا حصہ نہیں لینا، اطمینان رکھیں۔ میں تو صرف منے آئی تھی۔ اللہ نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے اب دوبارہ اپنوں سے ملنے کی آرزو نہیں کروں گی۔“]